اسلام اور مغرب کے مابین مکالمے کی ضرورت واہمیت

تحریر: محمد شفیع بلوچ

تاریخ، زبان، ثقافت، روایات اور سب سے بڑھ کر مذہب تہذیبوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ جیسے جیسے دنیا سکڑ رہی ہے مختلف تہذیبوں کے درمیان رابطے بڑھ رہے ہیں اور نتیجتاً تہذیبی شعور میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسلام اور یورپ کے درمیان اگرچہ کافی بُعد رہا ہے تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں ان کے درمیان کوئی قدر مشترک ہی نہیں۔ اسلام اور مغربی تہذیب اقدار کے لحاظ سے جس قدر ایک دوسرے کے قریب ہیں کوئی اور تہذیب نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کا منبع خدا پر ایمان رکھنے والے مذاہب میں ہے۔ خیر وشر اور دیگر اخلاقیات میں کافی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایک مغربی ادیب بہازین نے بہت خوبصورت بات کہی تھی کہ نظریات، فلسفے اور الٰہیات شاید ہمیں انسان اور انسانیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اپنے سیاسی ڈھانچوں، قومیتوں، سماجوں، ثقافتوں کے اختلافات کے باوجود سرحدوں سے آزاد ایک مشترک راستہ ہے۔ ہم آفاقی اقدار رکھتے ہیں۔ تمام معاشرے چند بنیادی، انسانی حقوق کے قائل ہیں، مثلاً: آزادئ اظہار، مذہبی رسوم کو ماننے کی آزادی، غربت اور امتیاز سے بالا زندگی، یکساں قوانین اور ہر قسم کے خوف سے آزادی، تمام معاشرے ظلم، قتل اور وحشت پر سزا دیتے ہیں۔ افراد کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خاندان، معاشرے اور قوم کے فائدے کے لیے پروان چڑھائیں۔ نرم خوش کلامی و کردار، باہم احترام ہمارے اکٹھے متوازن رہنے کے لیے لازمی ہیں۔ ہم ادیبوں کو خاندان، معاشرے اور قوم کے فائدے کے لیے پروان چڑھائیں۔ نرم خوش کلامی و کردار، باہم احترام ہمارے اکٹھے متوازن رہنے کے لیے لازمی ہیں۔ ہم ادیبوں کو ان کے لیے لازمی جدوجہد کرنا چاہیے کیونکہ یہ عظیم ترین انسانی اوصاف میں سے ہیں۔ دنیا نے ان یکتا انسانی اقدار کو تسلیم کیا ہے جو وقت کے معیار پر پوری اُترتی ہیں اور نسل، قومیت اور مذہب کی حدوں سے بالاتر ہیں۔[1]

اختلافات کا مطلب صرف تصادم یا محاذ آرائی نہیں ہوتا بلکہ اختلافات تو باہمی بات چیت اور مکالمے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اسلام اور مغرب کے مابین یا بالفاظ دیگر عالم اسلام اور دنیائے مسیحیت کے درمیان مکالمہ ومفاہمت انسانیت کے حال اور مستقبل کی بہتری اور اس کی نجات وفلاح کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔ مغرب اور عالم اسلام کے مابین مثبت تعلقات کا قیام باہمی عزت واحترام اور ایک دوسرے کے حقوق کو حقیقی معنوں میں تسلیم کرنے سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اسلامی ومغربی دنیاؤں کے درمیان مکالمہ ومفاہمت کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مغرب، جو سیاسی، اقتصادی اور عسکری قوت کے اعتبار سے دنیائے اسلام پر فوقیت وبالادستی رکھتا ہے اُن امور کے متعلق اپنے رویے میں مثبت تبدیلی پیدا کرے جو ان کے درمیان متنازع ہیں۔

مغرب کے نومسلم مستشرق علامہ محمد اسد لکھتے ہیں کہ اسلام اور عیسائیت کے عقائد وتعلیمات میں کتنا ہی بُعد کیوں نہ ہو دونوں کے اخلاقیاتی اقدار وضوابط میں بہت حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہی چیز ان کے مابین تعاون ومفاہمت کا حقیقی سبب بن سکتی ہے۔ دونوں فریقوں کے مابین مفاہمت کی بنیاد اور اس کا نکتہ آغاز مذہب ہی ہوسکتا ہے۔[۲] دنیا کی دیگر تمام اقوام کی طرح عیسائیوں میں بھی اچھے لوگ ہیں جو انسانی حقوق کا احترام کرتے ہیں اور اخلاقی اصولوں پر عمل کرتے ہیں جو اسلام کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ مسلمان بہت سے اہلِ مغرب کے مثالی طرزِ عمل کا اعتراف کرتے ہیں اور ان میں پائی جانے والی خوبیوں کو مسلمان اسلامی اوصاف کے عین مطابق تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مغرب کی کامیابی کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر مسلمانوں سے بھی زیادہ اچھی طرح عمل پیرا ہیں۔[۳]

پوپ جان پال دوئم ''کراسنگ دی تھری شولڈ آف ہوپ'' میں لکھتے ہیں: ''چرچ مسلمانوں کا بھی بے حد احترام کرتا ہے جو اس ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں جو حیّ وقیوم ہے، رحیم وکریم ہے اور وہی اس ارض وسما کا خالق ہے۔ (Nostra Aetae (3) اپنی توحید پرستی کی بنا پر اللہ پر ایمان رکھنے والے بالخصوص ہم سے بہت قریب ہیں۔ مسلمانوں کی دین داری اور پرہیزگاری لائقِ احترام ہے۔(۴) پوپ جان پال دوم کے مطابق: ''اگر صدیوں کے عرصے میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں اختلافِ رائے اور کچھ جھگڑے رہے، تب بھی یہ مقدس کونسل تمام لوگوں پر زور دیتی ہے کہ وہ ماضی کو بھول جائیں اور پوری انسانیت کی فلاح کے لیے سماجی انصاف، اخلاقی بہتری، امن اور آزادی کے لیے کام کریں (Nostra Aetate-e)''(۵)

اسلام اور مغرب کے درمیان مفاہمت کے لیے مسلمانوں نے ماضی میں اہل مغرب کے سامنے مؤثر، دلنشین اور قابل فہم انداز میں اہل مغرب کے محاورہ میں نیز ان کی ذہنی وفکری سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کو پیش کرنے کی انتہائی کم کوشش کی ہے۔ علامہ محمد اسد لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس حقیقت کا پورا پورا شعور وادراک ہونا چاہیے کہ اب تک انہوں نے اسلام کو اہل مغرب کے سامنے معقول، قابل فہم اور مؤثر دلنشین انداز میں پیش کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ اسلام اور دنیائے مغرب کے مابین مفاہمت کے لیے یہ امر انتہائی ناگزیر ضرورت کا درجہ رکھتا ہے کہ مسلمان مفکرین ومصنفین اہل مغرب کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو مؤثر اسلوب اور پیرائے میں پیش کریں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات کے بہت سے اُصول اور نکات ایسے ہیں جو مغرب کے مذہبی وتہذیبی ماحول میں پلے بڑھے افراد کے لیے بظاہر کوئی جاذبیت اور کشش نہیں رکھتے۔ دریں صورت مسلمانوں کا مذہبی واخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اسلام کے عقلی ودانش مندانہ اصول کو مغرب کے مسیحیوں کے فہم کے قریب تر لائیں۔[۶]

جہاں تک اسلام کے بارے میں یورپ اور امریکہ کے عمومی ذہن کا تعلق ہے اس میں اسلام اور اس سے متعلقہ امور کے بارے میں متوازن رویہ دیکھنے میں نہیں آیا اور مغربیوں کا از خود اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی قدیم ذہنیت کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں۔ بڑی حد تک اس کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ مغرب میں اسلامی فکر کو اور

اسلام کے پیغام کو مسلسل اور کسی قاعدہ قرینہ سے پیش نہیں کر سکے ہیں کیونکہ انہوں نے مغربی ذہنیت اور مغربی میلانات و رجحانات کو پیشِ نظر نہیں رکھا، دوسری طرف مسلمانوں نے اپنے مذہب اور سماجی وسیاسی مقاصد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت تند و تیز ہے اس لیے اس کو معقول تصور نہیں کیا گیا، حالانکہ اسلام اور مغرب میں مکالمہ کے لیے معقول اور مدلل بات کہنے کی ضرورت ہے۔[۷]

جرمن نومسلم دانشور مراد ہوف مین کے بقول: ''روزمرہ کے مشاہدے اور تجربے سے یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ موروثی مسلمان بہت زیادہ حد تک مغربی دنیا کو اپنے عقیدے و مذہب کی تبلیغ مؤثر طور پر کرنے میں ناکام رہتے ہیں، آخر کیوں؟ اس لیے کہ ایک مغربی انسان کا طرزِ فکر، اس کی ذہنی ساخت اور مذہبی نفسیات ایک مشرقی انسان سے بہت مختلف ہوتی ہے لہٰذا ان تک دعوت پہنچانے کے لیے داعی کو چاہیے کہ وہ ان کے ذہنی وفکری ارتقاء اور اسلام کے بارے میں ان کی تاریخی غلط فہمیوں کا لحاظ رکھے۔'' مراد ہوف مین کی رائے میں: ''یہ بات واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مغرب کی تمام غلط فہمیوں کے ڈانڈے تاریخی حقائق وارتقاء سے جا ملتے ہیں۔ کوئی بھی شخص جو اس تہذیبی پیش رفت سے آگاہ نہیں ہے مغرب میں دعوت وتبلیغ کا فرض کامیابی سے ادا نہیں کر سکتا چنانچہ کسی بھی خطے میں دعوت کا کام وہی کریں جو اس خطے کو مخصوص تہذیبی روایات میں پیدا ہوئے ہوں یا پلے بڑھے ہوں۔ داعی کو پتہ ہونا چاہیے کہ تبدیلی لانے اور قائل کرنے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے۔ اسلام کو ان غلط فہمیوں کا جواب انہی لوگوں کے ذریعے دینا چاہیے جو مخاطبین اور سامعین کے سامنے ان کی بولی انہی کے لب ولہجہ میں بولتے ہیں۔''[۸]

ایک دوسرے نامور نومسلم دانش ور حسن عبدالحکیم نے بھی مغرب میں دعوت وتبلیغ اسلام یا بالفاظ دیگر مغرب میں اسلام کے تعارف کے سلسلے میں موروثی مسلمانوں، جن میں روایت اور تجدید پسند دونوں طرح کے لوگ شامل ہیں، کے اسلوب تحریر و تقریر کے غیر مؤثر ہونے اور اہل مغرب کی طرف سے درپیش مذہبی نوعیت کے اہم سوالات کے اسلامی نقطۂ نظر سے تسلی واطمینان بخش اور مؤثر ودلنشین جوابات پیش نہ کرنے کا شکوہ کیا ہے۔[۹]

مغرب کے چند اہم دانشور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مغرب کو اسلام کے ساتھ تعمیراتی تعلقات کی بحالی کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر تھامس کلیری (Thomas Cleary) نے توجہ دلائی ہے:

> ''کمیونزم کے زوال کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ عالمی امن، نظم اور عوام کا حق خودارادیت، اسلام کے دانش مندانہ وقار واحترام اور مسلمانوں کے اس لاینفک حق کو تسلیم کیے بغیر کہ انہیں اپنے دین کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے، حاصل ہونا ممکن نہیں..... یہ تحمل، برداشت اور باہمی افہام وتفہیم کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر اقدام ہے جس کے بغیر عالمی امن کا تصور بھی ممکن نہیں۔''[۱۰]

اس ضمن میں برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس پرنس آف ویلز کا وہ بیان، جو انہوں نے برطانیہ کے دفتر خارجہ میں ۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ء کو ایک سیمینار سے خطاب کے دوران دیا، بڑا ہی خیال افروز ہے:

''اسلامی تہذیب وثقافت نے اپنے روایتی انداز میں، دنیا کے اس مکمل روحانی تصور کو محفوظ رکھنے کی اس طرح کی سعی کی ہے، جس طرح ہم نے مغرب کی حالیہ نسلوں میں کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم اسلام کے اس عالمی تصور سے کئی باتیں اخت کر سکتے ہیں۔ اس عالمی تصور میں ایسی بہت سی باتیں ہی جو ہمارے دونوں مذاہب میں موجود دائمی اور زندہ جاوید عناصر کو سمجھنے اور باہمی اشتراک میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔''[11]

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان متعدد بنیادی اختلافات کے باوجود، دونوں تہذیبوں میں ایسے عناصر موجود ہیں جن میں دونوں کے درمیان شراکت اور باہمی احترام کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ مغرب اسلام کے ساتھ معاندانہ طرزِ عمل ختم کرے اور اس کے نتیجے میں مسلم معاشرے کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے پروگراموں کی مخالفت بند کی جائے۔ پروفیسر جان ایل اسپوزیٹو نے بھی یہی بات کہی ہے:

''بعض لوگوں کے مشوروں کے برعکس، امریکہ کو اصولی طور پر اسلامی قوانین کے نفاذ اور حکومتوں میں اسلام کے سرگرم حامیوں کی شرکت پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے.....امریکہ کو ایسی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت یا اعتراضات سے باز رہنا چاہیے، جہاں اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آ رہا ہے یا اسلامی پروگرام شروع کیے جا رہے ہیں، اسی طرح ان اسلامی تنظیموں کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے، جن کے اسلامی پروگرام یا اسلامی سرگرمیوں سے امریکہ کے لیے کسی نوع کا خطرہ نہیں، چنانچہ امریکی پالیسیوں پر عمل درآمد اس پس منظر میں ہونا چاہیے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان نظریاتی اختلافات تسلیم شدہ ہیں، تاہم زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک، ان اختلافات کو کم از کم سطح پر برداشت کیا جائے۔''[12]

ہن ٹنگٹن نے بھی تہذیبوں کے درمیان مفاہمت اور تعاون کے بارے میں چند الفاظ کہے ہیں:

''امن اور تہذیب دونوں کے مستقبل کا انحصار، دنیا کی دو بڑی تہذیبوں کے سیاسی، روحانی اور روشن خیالی رہنماؤں کے درمیان مفاہمت اور تعاون پر ہے۔''[13]

اسلام نے تو اپنے آغاز ہی سے، اس دنیا اور اس میں بسنے والے عوام کے بارے میں کثرتیت (Pluralistic) پر مبنی رویہ اختیار کیا ہے۔[14] اسلام تو بھائی چارے اور امن وآشتی کا مذہب ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں اسلامی سوچ قرآن میں متعدد جگہوں پر واضح ہدایات پر مبنی ہے۔ مثلاً اللہ نے مسلمانوں کو دوسروں سے رواداری کا حکم دیا ہے اور انہیں دوسرے مذاہب اور مظاہر عبادت کی توہین سے منع کیا ہے:

''اور (اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔'' (سورۃ ۶:۱۰۸)

اسلام بلاشبہ دینِ انسانیت اور آفاقی تہذیب کا حامل ہے۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ اصل تہذیب یہ ہے کہ انسان، ملتوں اور جماعتوں کے تعصّبات سے بلند تر ہو سکے۔ اسلام کے نزدیک بنی نوع انسان، بقول شیخ سعدیؒ ایک ہی بدن کے اعضاء ہیں۔ کیونکہ وہ تخلیق اور پیدائش میں ایک ہی گوہر سے ہیں:[۱۵]

بنی آدم اعضای یک پیکرند
کہ درآفرینش ز یک گوھرند

آسٹریلیا کے بروس واٹس نے اسلامی تاریخ وتہذیب کے وسیع مطالعے کے بعد لکھا کہ اسلام نے اخلاقی اقدار کی محوری حیثیت کی انسانی معاشرے کی تعریف شدہ کردار کے طور پر حفاظت کی ہے۔[۱۶] جب یورپ ''دورِ ظلمت'' میں جہالت اور بربریت سے گزر رہا تھا اسلام نے حفاظتِ علم میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مغرب نے اس علم کی بازیافت اور اصلاح کی جس کے نتیجے میں اسے سائنس اور ٹیکنالوجی پر تسلط ہو گیا۔ یورپ پر سے فاسد اور دنیا پرست مذہبی رہنماؤں کا تسلط ختم ہو گیا۔ اسلام کی فتوحات ملکی ابتدا کے وقت مسلمانوں کی مسجد کے پہلو بہ پہلو کلیسا، آتش کدہ اور یہودیوں کے کنیسے کو گوارا کیا جاتا تھا اور اس کے لیے محض ایک خفیف ٹیکس (جزیہ) طلب کیا جاتا تھا۔ اپنے عالمانہ مقالے: Christianity in its Relation to Islam میں مشہور عالم جی۔ پی۔ بے جر (Badger) نے خوب کہا ہے کہ ترکوں نے اگر خونریز مظالم کیے ہیں تو اس کا الزام اسلام کے سر اُسی طرح نہیں دہرایا جا سکتا جس طرح سینٹ بارتیلمی (St. Barthelemy) کے حکم سے عمل میں لائے ہوئے قتل ہائے عام اور احتساب مذہبی (Inquisition) کے نام سے (بدعقیدہ) عیسائیوں کو جو سزائیں دی گئیں ان کی ذمہ داری عیسائیت کے سر نہیں تھوپی جا سکتی۔[۱۷]

کیرن آرم سٹرانگ، لکھتی ہیں کہ اسلامی سلطنت میں عیسائیوں اور یہودیوں کو زرتشتیوں، بدھ کے ماننے والوں اور ہندوؤں کی طرح مکمل آزاد حاصل تھی۔ یہ پالیسی صرف مذہبی آئیڈیالوجی کا ثمر نہیں تھی بلکہ یہ ایک مضبوط سیاسی شعور کی بھی آئینہ دار تھی۔[۱۸] شارلیمان کے دور میں اس کے دارالسلطنت میں خلیفہ ہارون الرشید کا سفارت خانہ موجود تھا اور وہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرتا تھا اس زمانے میں مغرب کا دشمن اسلام نہیں بلکہ بازنطین تھا۔[۱۹] یہی مصنفہ لکھتی ہیں: قرآن نے مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ انہیں یہودیوں اور عیسائیوں کا احترام لازماً کرنا چاہیے، کیونکہ وہ اہلِ کتاب ہیں..... بلاشبہ اسلام کی ایک عظیم ترین قدر ضمیر اور فکر کی آزادی ہے۔ اسلام میں ہر فرد ضمیر اور فکر کی آزادی کا حق رکھتا ہے۔ یسوعؑ کی طرح حضرت محمد (ﷺ) نے غریبوں اور کم حیثیت والے لوگوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ اس حوالے سے اسلام جوہری طور پر ایک انقلابی مذہب تھا۔ بلاشبہ انقلاب اور سماجی انصاف اسلام کی اہم اقدار ہیں۔[۲۰]

آکسفورڈ کے فاضل پروفیسر مونیر ولیمس (Monier Williams) نے کرائیڈن میں منعقد چرچ کانگریس میں مشورہ دیا تھا کہ پادریوں کو مسلمانوں سے بحث کرنے سے پہلے قرآن کا اصل عربی میں غائر مطالعہ کرنا چاہیے، پھر مشترک چیزوں پر اتفاق ظاہر کر

کے اختلافی چیزوں سے بحث کرنی چاہیے اور مسلمانوں سے (موجودہ) توریت اور انجیل کی صداقت منوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گارساں دتاسی لکھتا ہے کہ ویسے مسلمان ان دونوں کے برحق ہونے کو اب بھی مانتے ہیں، صرف یہ کہتے ہیں کہ ان میں تحریف ہوئی ہے۔[۲۱]

عیسائیوں نے بڑی حد تک یہودیوں کو معاف کر دیا ہے جن پر وہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ عیسائی یہودیوں کے مسمار شدہ معبد کی جگہ کو برسوں سے کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس جگہ کو صاف کیا۔ وٹیکن نے اسرائیل کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ امریکہ آج اسرائیل کا سب سے بڑا محافظ اور سرپرست ہے اور ان دونوں مذہبوں کے درمیان تعاون ہو رہا ہے آخر اسلام کے ساتھ مکالمہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ کوئی بھی مسلک ملک یا اسلامی تحریک مغرب، چین، جاپان اور امریکہ یا کسی بھی دوسرے ملک کی سیاسی قوت کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ تو صرف اپنے علاقوں کی بحالی اور اقتدار اعلیٰ کی بحالی چاہتے ہیں اور تمام بین الاقوامی امور پر مذاکرہ اور مکالمہ چاہتے ہیں۔

اسلام اور مغرب ایک دوسرے کے لیے بہت کارآمد امور پیش کر سکتے ہیں تاہم اگر بدگمانی، تعصب اور خوف پر مبنی نقطۂ نظر ہو تو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اسلام اور مغرب کے درمیان باقاعدہ اور مسلسل مذاکرات کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کی قدر جان سکیں اور ایک دوسرے کی توقیر کر سکیں۔ لیکن یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوگا جب تک مغرب اپنا یہ اصرار ترک نہیں کرے گا کہ اُسے ''سلام'' کریں اور ''سفید فام کا بوجھ'' برداشت کریں۔[۲۲]

امریکی سیاہ فام مسلمانوں کے رہنما میلکم ایکس خودنوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں؛

> ''ضرورت ہے کہ امریکہ اسلام کو پوری طرح سمجھے کیونکہ صرف یہی ایک مذہب ہے جس نے اپنے معاشرے سے نسلی امتیاز کا مسئلہ ختم کر دیا۔ مسلمان ملکوں میں سفر کے دوران میری ملاقات ایسے بہت سے لوگوں سے ہوئی بلکہ ان کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا جنہیں امریکہ میں گورا سمجھا جاتا تھا لیکن اسلام نے ان لوگوں کے دماغوں سے ''گوری ذہنیت'' ختم کر دی ہے۔ میں نے اخلاص سے اس قدر بھرپور اور بھائی چارے کے جذبے کی اتنی سچی مثال کبھی نہیں دیکھی جہاں کسی قسم کے امتیاز کے بغیر ہر رنگ کے لوگ اس رشتے میں برابر کے شریک ہوں۔'' (ص ۳۴۰)

بعض افراد ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام کسی تبدیلی کو قبول نہیں کرتا۔ P.J.Vaikiotis کہتا ہے کہ یہ ایک کمزور نقطہ ہے۔ اسلام ایک بلند مرتبہ روایت ہے۔ اس پہلو سے مغربی نظریات صرف تحقیر کنندہ نہیں ہیں بلکہ بعض صورتوں میں اسلام اور اسلامی دنیا کے ساتھ بے ربط ہیں اور اس پر منطبق نہیں ہو سکتے۔''[۲۳] فرانسس لی ماند، جو فرانس کی انجمن اسلام و مغرب کے سربراہ ہیں کا نظریہ ہے کہ اسلام مغرب میں تین بنیادی اقدار کے احیا میں مدد دے سکتا ہے۔ اجتماعی شعور، دنیا کے اس حصے

میں جہاں فرد پرستی میں اضافہ ہوگیا ہے، مذہبی شعور اور قانونی شعور۔[۲۴] چنانچہ بقول بروس واٹسن کو چاہیے کہ اپنی تسلط اور اقتدار پسند طبیعت کو لگام دے اور باقی دنیا کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کا پھر سے جائزہ لے۔ یہاں تک کہ ''باقی دنیا'' ہونے کا تصور جس حوالے سے بھی ہو، ہم سب کو اسے تبدیل کرنا چاہیے۔[۲۵]

دنیائے اسلام اور مغرب کے مابین مکالمہ ومفاہمت کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ باہمی بداعتمادی (Mutual Distrust) ہے۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی مغرب کے بارے میں بداعتمادی وبدگمانی گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں آزاد مسلم ممالک پر مغرب کی استعماری طاقتوں کے غاصبانہ تسلط اور محکوم مسلم اقوام کے ساتھ اُن کے برتاؤ کے سبب سے ہے۔ مغرب کو چاہیے کہ وہ اسلام کو سمجھے، اس لیے نہیں کہ اسلام مستقبل کا عظیم خطرہ ہے بلکہ اس لیے کہ اسلام کے پاس بکثرت اخلاقی افکار واقدار ہیں اور مغرب کو چاہیے کہ سیکولرزم کی طرف رینگتے ہوئے حال میں ان سے استفادہ کرے۔ علاوہ ازیں مغرب کو چاہیے کہ دنیا میں مسلمانوں کے متنوع تجربات کو شناخت کرے۔ مسلمان معاشرے نہ فقط بعض ''اسلامی'' مسائل کے حل نہ ہو سکنے پر پریشان ہیں بلکہ طویل مدت سے ان ہی مسائل سے دوچار ہیں جن کا مغرب کو سالہا سال سے سامنا رہا ہے، مثلاً اجتماعی و اخلاقی ارتقا اور ماحولیاتی، اقتصادی وسیاسی ترقی۔ اس طرح کے مظاہر کے ساتھ انسانی تجربات اور سودمند اقدامات بھی ہوتے ہیں۔ ٹیکنالوجی، میڈیسن اور تعلیم میں بھی منصفانہ تعاون ہونا چاہیے۔ اگر مغربی اقوام اپنے تعریف شدہ مفاہیم کی اہمیت پر اعتماد رکھتی ہے مثلاً فردیت انسانی آزادی، قانون پسندی، انسانی حقوق، مساوات، قانون کی بالادستی، آزادمنڈی اور کلیسا اور حکومت کی جدائی تو ایسے میں انہیں چاہیے کہ دوطرفہ مکالمے میں شریک ہوں نہ یہ کہ دوسروں پر دھونس جمائیں۔

مغربی تہذیب کو عالمی تہذیب کے طور پر پھیلانے کے لیے مغرب نے جو جدوجہد کی ہے وہ جدید استعماریت (ثقافتی استعماریت، حقوقِ بشر وغیرہ) کے مقابلے میں شدید عملوں کا باعث بنی ہے۔ نئے سرے سے مذہب کا رواج اور نوجوان نسلوں خاص طور پر ہندو اور اسلامی ثقافتوں میں نئے سرے سے روایتی اقدار پر اسرار زیادہ تر مغربی ثقافت کے اچانک حملوں کے اثرات کا ردعمل ہے۔[۲۶]

جب تک مغرب مسلمانوں کے دین، ان کی مقدس مذہبی شخصیات اور ان کے تہذیبی وسماجی اصول واقدار کے بارے میں معاندانہ رویہ ترک نہیں کرتا ان کے بارے میں اپنے قدیم متعصبانہ رویے میں مثبت تبدیلی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور مسلمانوں کے جائز سیاسی مقام وحیثیت اور حقوق کو تسلیم نہیں کرتا۔ مزید برآں وہ مسلم ممالک میں اسلامی بیداری کی تحریکوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور ان پر شدت وجنونیت پسندی (Fanaticism) اور طرح طرح کے دوسرے القابات چسپاں کرنے کا سلسلہ موقوف نہیں کرتا دنیائے اسلام سے اس کے تعلقات میں بہتری نہیں آسکتی۔ گیند تو ''مہذب مغرب'' کے کورٹ میں ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ بہازین، شاعر، شاعری اور انسانیت (اردو ترجمہ: امجد طفیل) مطبوعہ: سہ ماہی ''ادبیات''، اسلام آباد، (بین الاقوامی ادب نمبر ۵) جلد ۱۱، شمارہ ۴۳، ۴۴ بہار، گرما، ۱۹۹۸ء، ص: ۹۸۹)

۲۔ Muhammad Asad, "The Encounter of Islam and the West," This law of Ours, Gibraltar: Dar-al-Andalus, 1987,p.126

۳۔ علی نواز میمن: ملتِ اسلامیہ' (مترجم صفوت قدوائی)، انجمن ترقی اردو پاکستانی، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۷۷

۴۔ پوپ جان پال دوئم ''کراسنگ دی تھری شولڈ آف ہوپ'' نیویارک، الفراڈ ے نوف، انکارپوریٹڈ، ۱۹۹۴، ص ۹۱

۵۔ ایضاً، ص ۹۳

۶۔ Muhammad Asad, "The Encounter of Islam and the West," p.127

۷۔ ————————, Islam at the Cross roads, Last rev. edn. Gibraltar: Dar-al-Andalus, 1982, p.57

۸۔ Murad W. Hofmann, "Review" [by Jaffery Lang] of Struggling to Surrender, Some impression of an American Convert to Islam, Islamic Studies, 36:4 (1997): 682

۹۔ Gai Eaton, Islam and the Destiny of Man, Lahore Suhail Academy, 1997, pp;11,12

۱۰۔ تھامس کلیری (Thomas Cleary)، The Essential Koran، ہارپر، سان فرانسسکو، ۱۹۹۳، ص ۸

۱۱۔ شہزادہ چارلس: A Sence of the Sacred؛ مشمولہ: Impact International، جنوری ۱۹۹۷، ص ۲۳

۱۲۔ پروفیسر جان ایل اسپوزیٹو، (John L. Esposito) The Islamic Threat : Myth or Realiy?، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، آکسفورڈ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۸، ۲۰۹

۱۳۔ سیموئیل پی ہن ٹنگٹن، The Clash of Civilization and the Remaking of World Order، سائمن اینڈ شوسٹر، نیویارک، ۱۹۹۶، ص ۱۰۱۔

۱۴۔ (پروفیسر خورشید احمد، Islamic Resurgence: Challanges, Direction and Future Prespective، مرتبہ: ابراہیم ابو ربیعہ، ٹمپا، فلوریڈا، ۱۹۹۴، ص ۶۵

۱۵۔ شیخ سعدی، کلیاتِ سعدی، از نسخہ فروغی، انتشارات موسیٰ علمی، گلستان، ص ۱۸

۱۶- بروس واٹسن (نیو انگلینڈ یونیورسٹی، آرمیڈیل، آسٹریلیا) ''جدید دور میں اسلام کو درپیش چیلنج'' فارسی سے اردو ترجمہ: ثاقب اکبر، مشمولہ سہ ماہی ''پیغام آشنا'' اسلام آباد، شمارہ ۲۳، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۵

۱۷- مقالاتِ گارساں دتاسی، جلد دوم (مقالہ ۱۸۷۷ء) انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت دوم، ۱۹۷۵ء، ص ۵۲۵

۱۸- کیرن آرم سٹرانگ، مقدس جنگ، (مترجم: محمد احسن بٹ) نگارشات، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۷

۱۹- ایضاً، ص ۷۸

۲۰- ایضاً، ص ۵۵

۲۱- (مقالاتِ گارساں دتاسی، جلد دوم، (مقالہ ۱۸۷۷ء) محولہ بالا، ص ۵۲۶

۲۲- ڈاکٹر محمد ممتاز علی تہذیبی تصادم یا بقائے باہمی، (مرتب و مترجم: سلیم منصور خالد)، مطبوعہ منشورات، لاہور، طبع اول ۲۰۰۶ء، ص ۹۳

۲۳- P.J. Vatikiotis, "Islam and the State" Routledge London, (Rep) : 191, p; 67

۲۴- Cited in M.A. Yamani, "Islam is not an enemy of the West", Reprinted in AUSTRALIAN MUSLIM NEWS " vol. 1, No. 5 (1994), p ; 9

۲۵- بروس واٹسن، محولہ بالا، ص ۱۰۵

۲۶- ایضاً، ص ۱۰۳، ۱۰۴

☆☆☆